AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

آغا گل کے ناول "دشت وفا" میں سبالٹرن ازم کے عناصر: فکری مطالعہ

AGHA GUL’S NOVEL DASHT-E-WAFA: A CRITICAL STUDY OF THE ELEMENTS OF SUBALTERNISM

- **Fouzia Akhtar** • فوزیہ اختر

PhD Urdu Scholar, My University Islamabad
Email wardaanfaisal111@gmail.com

- **Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari** • ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری

Professor, Department of Urdu, My University Islamabad
Ex-HOD, Karakoram International University, Gilgit-Baltistan

Abstract:
Agha Gul’s novel Dasht-e-Wafa portrays the socio-political realities of Balochistan through the lens of subaltern studies. This research highlights the representation of marginalized voices, identity crises, and resistance against oppressive power structures within the novel. The characters reflect communities shaped by state dominance and tribal hierarchies. From a subaltern perspective, the text questions whether the marginalized can truly express their own voice. Ultimately, Dasht-e-Wafa emerges as a powerful narrative of resistance and a critique of hegemonic authority.

Keywords: Dasht-e-Wafa, Agha Gul, Subalternism, Balochistan, Marginalization, Resistance, Identity Crisis, Power Structures, Hegemony

کلیدی الفاظ: دشتِ وفا، آغا گل، سبالٹرن ازم، بلوچستان، حاشیہ نشینی، مزاحمت، شناختی بحران، طاقت کے ڈھانچے، بالا دستی

مابعد نو آبادیاتی مطالعات میں سبالٹرن کا تصور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اصطلاح ان پسے ہوئے طبقات کی نمائندگی کرتی ہے جو تاریخی، سماجی اور سیاسی بیانیوں میں اکثر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ سبالٹرن اسٹڈیز نے تاریخ نویسی کے روایتی طریقوں کو چیلنج کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ کیا تاریخ صرف اشرافیہ، حکمران طبقات اور سیاسی مقتدرہ کی کہانی ہے یا اس میں عام لوگوں کی آواز اور جدوجہد بھی شامل ہونی چاہیے۔ اسی تناظر میں ہندوستان کی تاریخ کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی جہاں عوامی طبقے کی سیاسی و سماجی حیثیت کو مرکزی حیثیت دینے پر زور دیا گیا۔ وکی پیڈیا کے مطابق:

> "The terms subaltern and subaltern studies entered the vocabulary of post-colonial studies through the works of the Subaltern Studies Group of historians who explored the political-actor role of the common people who constitute the mass population, rather than re-explore the political-actor roles of the social and economic elites in the history of India(1)".

سبالٹرن اسٹڈیز تاریخ کو دیکھنے کا ایک ایسا زاویہ ہے جس میں توجہ عام اور محروم طبقوں کی زندگی، مسائل اور تجربات پر مرکوز کی جاتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق تاریخ کو صرف حکمرانوں اور طاقتور طبقوں کے نقطہ نظر سے بیان نہیں کرنا چاہیے بلکہ معاشرے کے اُن افراد کی کہانی بھی شامل ہونی چاہیے جو عام طور پر تاریخ کی کتابوں میں نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ سبالٹرن اسٹڈیز دراصل اس روایت کے خلاف ایک فکری ردِ عمل کے طور پر سامنے آئی جس میں تاریخی بیانیہ زیادہ تر اشرافیہ کے کارناموں تک محدود رہا۔

یہ مکتبہ فکر 1981-82 کے دوران رنجیت گوہا اور ان کے ساتھی محققین جیسے شاہد امین، گیان پرکاش، دیپیش چکرورتی اور ڈیوڈ ہارڈیمین کے ذریعے شروع کیا گیا۔ ان کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ماضی کی تاریخ نگاری زیادہ تر طاقتور طبقات کے نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہے جس کے باعث عام لوگوں کی جدوجہد اور ان کی سوچ کو

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مناسب جگہ نہیں مل سکی۔ رنجیت گوہانے بنگال میں ایک مقامی بغاوت پر تحقیق کرتے ہوئے اس فکری سلسلے کی بنیاد رکھی جس کے بعد یہ نظریہ مزید فروغ پاتا گیا۔ اس زمانے میں مارکسزم اور نکسل ازم جیسی فکری تحریکوں کا اثر بھی فکری فضا پر موجود تھا۔ سبالٹرن اسٹڈیز کے تحت ہر دو سال بعد تحقیقی مضامین پر مشتمل مجموعے شائع کیے جاتے تھے جن میں مختلف سماجی اور تاریخی پہلوؤں پر کام شامل ہوتا تھا۔ بعد ازاں اس مکتبہ فکر نے بین الاقوامی سطح پر بھی اثرات مرتب کیے خاص طور پر لاطینی امریکہ کے محققین نے اس سے متاثر ہو کر اپنے علاقوں کی تاریخ کو نئے زاویوں سے دیکھنا شروع کیا۔ اس تحریک کا مقصد نوآبادیاتی اور قوم پرستانہ تاریخی بیانیے کے خلاف لکھنا تھا، کیونکہ ان بیانیوں میں عام لوگوں کی خواہشات اور زندگی کے مسائل کو اکثر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یورپ میں بھی عام طبقے کی تاریخ لکھنے کی روایت مختلف تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں مضبوط ہوئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد مزدور طبقے کی پیدائش ہوئی جس نے غربت، استحصال اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف شعور حاصل کیا۔ اسی طرح 1789 کے فرانسیسی انقلاب میں بھی مزدوروں، خواتین اور دستکاروں نے فعال کردار ادا کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران بھی عام شہریوں اور خواتین نے معاشی اور سماجی نظام کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، کیونکہ مرد محاذِ جنگ پر چلے گئے تھے۔

سبالٹرن تاریخ نگاری میں زبانی تاریخ کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ پہلے تاریخی ریکارڈ زیادہ تر سرکاری دستاویزات پر مبنی ہوتے تھے، لیکن بعد میں عام لوگوں کی یادداشتوں، انٹرویوز اور روزمرہ زندگی کے تجربات کو بھی تاریخ کا حصہ بنایا جانے لگا۔ اس طریقے نے محروم طبقوں کی نمائندگی کو مضبوط کیا اور تاریخ کے دائرے کو وسیع کیا۔

برصغیر میں بھی اس نظریے کے تحت تاریخ نویسی میں تبدیلی آئی۔ اگرچہ مارکسی مورخوں نے مزدور تحریکوں پر کام کیا، لیکن کسانوں، چرواہوں اور دستکاروں کی زندگی کو کم توجہ دی گئی۔ اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے ہندوستان میں سبالٹرن اسٹڈیز کا آغاز ہوا جس کا مقصد گمشدہ تاریخی آوازوں کو دوبارہ زندہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں عوامی تاریخ نویسی کے منصوبے بھی شروع کیے گئے تاکہ عام لوگوں کی زندگی اور جدوجہد کو محفوظ کیا جا سکے۔

پاکستان کے تناظر میں بعض ناقدین کے مطابق ریاستی تاریخ نگاری میں زیادہ تر سیاسی رہنماؤں اور قومی ہیروز پر توجہ دی جاتی ہے جبکہ عام لوگوں کی زندگی اور ان کی جدوجہد کو کم جگہ ملتی ہے۔ اس صورتحال میں عوامی تنظیموں، طلبہ یونینز اور مزدور تحریکوں کی کمزوری کو بھی اس رجحان کی ایک وجہ سمجھا جاتا ہے۔ سبالٹرن اسٹڈیز نے تاریخ نویسی کے طریقہ کار کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے مورخین کو یہ احساس دلایا کہ تاریخ صرف طاقتور طبقات کی کہانی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر فرد کی اجتماعی جدوجہد کا بیان ہونی چاہیے۔

آغا گل اردو ادب کے ایک اہم تخلیق کار اور بلوچستان کی ثقافتی و سماجی روایت کے نمائندہ ادیب ہیں۔ ان کا اصل نام آغا انور گل ہے جبکہ وہ ادبی دنیا میں آغا گل کے قلمی نام سے معروف ہوئے۔ ان کی پیدائش 19 نومبر 1951ء کو بلوچستان کے علاقے ہرنائی، کوئٹہ میں ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد محمد اکبر خان تعلیمی شعبے سے وابستہ ایک ممتاز شخصیت تھے جنہوں نے برٹش بلوچستان کے تعلیمی نظام میں نمایاں خدمات انجام دیں اور بعد ازاں اعلیٰ انتظامی عہدوں تک پہنچے۔ اسی علمی ماحول اور خاندانی روایت نے آغا گل کی شخصیت اور فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

آغا گل کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ابتدا سے ہی رہا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ سے کیا، جبکہ انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن گورنمنٹ سائنس کالج اور گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ سے مکمل کی۔ بعد ازاں انہوں نے بلوچستان یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور مزید علمی وسعت کے لیے انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ تدریسی میدان میں بھی انہوں نے خدمات سرانجام دیں اور بعد میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے بیوروکریسی کے شعبے سے وابستہ ہو گئے جہاں سے وہ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پاکستان پوسٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آغا گل کے ناول میں بیلا، بابو، دشت وفا، فسانہ جنات، کافر عشقم اور غازی نور احمد میگل وغیرہ شامل ہیں۔

اردو فکشن میں علاقائی شناخت اور تہذیبی نمائندگی کی روایت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بعض ادیب اپنے مخصوص جغرافیائی خطے کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کو اس قدر گہرائی اور تسلسل سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں سے ایک مکمل فکری اور تہذیبی بیانیہ تشکیل پاتا ہے۔ اسی تناظر میں آغا گل کی تحریریں بلوچستان کی اجتماعی زندگی وہاں کے معاشرتی مسائل اور ثقافتی رنگوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بلوچستان ایک فکری اور تہذیبی شناخت کے طور پر سامنے آتا ہے جسے بعض ناقدین نے "بلوچستان ازم" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

"آغا گل نے بلوچستان پر اتنی شد و مد سے لکھا ہے کہ اب ان کی تحریروں سے مجموعی طور پر بلوچستان کی جو تصویر بنتی ہے اس کو بلوچستان ازم کا نام دیا جاسکتا ہے۔"(2)

آغا گل کی تحریروں میں بلوچستان کی دھرتی اپنی تمام تر رعنائیوں اور محرومیوں کے ساتھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ صدیوں پرانی روایات کے امین بھی ہیں اور جدید سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے دباؤ میں اپنی شناخت بچانے کی جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ ان کہانیوں میں بلوچستان کی زندگی کے تضادات، غربت، قبائلی نظام اور احساسِ محرومی کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔

آغا گل کی تحریروں میں مقامی زبانوں بلوچی، براہوی اور پشتو کے الفاظ و اسالیب کا بر محل استعمال ان کے فکشن کو علاقائی اور تہذیبی رنگ عطا کرتا ہے۔ ادبی حلقوں میں انہیں اردو کے ان تخلیق کاروں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے مرکز کے بجائے حاشیے کو موضوع بنایا۔ یہی رجحان آگے چل کر ان کے ہاں سبالٹرن فکشن کی صورت میں ایک واضح اور مستقل فکری سمت اختیار کر گیا ہے۔ آغا گل کے کے ہاں سبالٹرن صرف ایک نظری اصطلاح نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان ہے وہ سپاہی جو حکم کی تعمیل میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ وہ قبائلی نوجوان جو سرداری یا نو آبادیاتی نظام کے جبر میں اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ وہ مزدور جو معاشی استحصال کا شکار ہے اور وہ عام شہری جو سیاسی فیصلوں کا بوجھ اٹھاتا ہے مگر فیصلہ سازی میں شامل نہیں ہوتا۔ بلوچستان کی تاریخ خصوصاً نو آبادیاتی عہد اور اس کے بعد کے سیاسی حالات آغا گل کے ہاں سبالٹرن بیانیے کی بنیاد بنتے ہیں۔ اس حوالے سے آغا گل خود بیان کرتے ہیں:

"ہر انسان کو اپنی ماضی سے محبت ہوتی ہے۔ بلوچستان کے پہاڑ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس لیے میں نے بلوچستان پر لکھا ان کے پیاز، ان کی ندیاں بلوچستان پر لکھنے والے کم تھے۔ یہاں پر پہلے پریں وغیرہ نہیں تھے تو اس اس لیے میں نے بلوچستان پر فوکس کیا کیونکہ یہ ایک بڑا مظلوم علاقہ ہے"(3)

ان کی تحریروں میں لیویز فورس، قبائلی نظام، سرداری سیاست اور ریاستی طاقت کے باہمی تعلقات کو اس زاویے سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری طاقت کے مرکز کے بجائے محکوم فرد کی آنکھ سے منظر دیکھنے لگتا ہے۔ ان کے کردار اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا ذکر سرکاری تاریخ میں نہیں ملتا مگر وہی دراصل تاریخ کا اصل بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

آغا گل کے ناول دشتِ وفا (بعض اشاعتوں میں دشت میں سفر کے نام سے مذکور) ہے۔ یہ ناول 2017ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں محبت، ہوس، سماجی جبر، عائلی انتشار اور اخلاقی زوال کے باہمی رشتوں کو ایک المیہ داستان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول دشتِ وفا محض نجیب اور رخسانہ کی محبت کی داستان نہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی تصویر ہے جس میں تعلیم یافتہ نوجوان اپنے ہی وطن میں اجنبیت کا شکار ہیں۔ آغا گل لکھتے ہیں:

"دشت کا سفر ناول دشت وفا کے نام سے بھی آغا گل کے ناولوں میں شامل ہے مگر آخر میں بڑی تبدیلی کے ساتھ۔ دشت میں سفر نامی ناول میں فرضی کردار نجیب کی جگہ پر وہ لکھا گیا ہے اور دشت وفا میں وہ کی جگہ پر نجیب لکھا ہے۔ دشت میں سفر کا اختتام یوں ہوتا ہے کہ رخسانہ اکیلی رہ جاتی ہے جب کہ دشت وفا کے اختتام کو ایک نیا انجام دیا گیا ہے، جس میں نجیب اور رخسانہ زندہ رہتے ہیں، پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں عظیم مقصد کے لیے لڑتے لڑتے دونوں محبت کو امر کر کے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔"(4)

جیسا کہ سبالٹرن ازم کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ تاریخ اور سماجی بیانیے عموماً طاقتور طبقات کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، جب کہ اصل عوام، محکوم گروہ اور حاشیے پر موجود افراد اپنی آواز کھو بیٹھتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی فکر میں اس نظریے کو باقاعدہ علمی بنیاد دینے والوں میں رنجیت گوہا اور گایاتری چکرورتی اسپیواک شامل ہیں جنہوں نے اس بات پر زور دیا کہ حاشیے کے لوگ اپنی نمائندگی خود نہیں کر پاتے بلکہ ان کی کہانی دوسروں کے ذریعے بیان کی جاتی ہے۔ دشتِ وفا اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک ادبی کوشش محسوس ہوتا ہے جہاں بلوچستان کے نوجوان، عورتیں اور عام شہری خود کہانی کا مرکز بن جاتے ہیں۔ آغا گل کا ناول دشتِ وفا بلوچستان کے معاصر سیاسی و سماجی حالات کو واضح کرتا ہے:

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"دشت وفا آغا گل کا ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول بلوچستان کی حالیہ دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں وہ حالات پیش کیے گئے ہیں جب نوجوان مایوس ہو کر پہاڑوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور پھر آزادی کے لیے جو راستہ منتخب کرتے ہیں انہیں کس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"(5)

بلوچستان سے تعلق رکھنے والے آغا گل جس طبقے کی زندگی سب سے زیادہ نمایاں کرتے ہیں وہ مڈل اور لوئر مڈل کلاس ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ مکمل طور پر بااختیار اشرافیہ میں شامل ہے اور نہ ہی بالکل نچلے طبقے کی طرح بے نام و نشان؛ بلکہ معاشرتی دباؤ، معاشی تنگی اور سیاسی بے یقینی کے درمیان پسا ہوا ہے۔ آغا گل چونکہ بلوچستان کی زمین، تاریخ اور نفسیات سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں اس لیے ان کا موضوع بھی اسی خطے کی سماجی حقیقتوں سے جڑا ہوا ہے۔

"آغا گل کے کرداروں کا تعلق مڈل اور اور مڈل کلاس سے ہے۔ چوں کہ ان کا موضوع بلوچستان ہے، بلوچستان سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے ایک پس ماندہ صوبہ ہے اور اس کے عوام بھی زندگی کی بنیادی سہولتوں (امن، تعلیم، روزگار، صحت، وغیرہ) سے محروم ہیں۔"(6)

"دشت وفا" ناول میں ایسے ہی کردار سامنے آتے ہیں جو سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے ایک پس ماندہ حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ناول کا سب سے بڑا سبالٹرن کردار خود بلوچستان ہے۔ یہ خطہ جغرافیے سے زیادہ ایک تاریخی محرومی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ پرانے کوئٹہ کی آزاد فضا، ہوٹلوں کی محفلیں، موسیقی، سماجی ہم آہنگی اور ثقافتی تنوع ایک ایسے عہد کی یاد دلاتے ہیں جب شناختی سیاست نے شدت اختیار نہیں کی تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی بے اعتنائی، سرداری نظام اور وفاقی عدم توجہی نے اس خطے کو مرکز سے دور کر دیا۔ سبالٹرن ازم کے مطابق جب کسی خطے کو فیصلہ سازی کے عمل سے خارج رکھا جائے تو وہ محض انتظامی اکائی نہیں رہتا بلکہ حاشیہ بن جاتا ہے۔ ناول میں بلوچستان اسی حاشیے کی اجتماعی تقدیر کی صورت سامنے آتا ہے۔ "دشتِ وفا" بلوچستان میں طاقت، ریاست، عالمی سیاست اور مقامی محکوم طبقات کے باہمی تصادم کی داستان ہے۔ آغا گل کے ہاں بلوچستان سبالٹرن خطہ ہے جس کی شناخت، وسائل اور سیاسی حقِ خود ارادیت عالمی طاقتوں اور مقامی اشرافیہ کے درمیان کشمکش کا شکار ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"زندگی بہت بور ہو چکی تھی۔ بلوچستان کو بلوچستان کہنا ہی جرم تھا۔ اسے کوئٹہ قلات ڈویژن کہا جاتا تھا۔ لفظ بلوچستان قابل دست اندازی پولیس تھا۔ صوبہ بلوچستان بنا تو امید تھی کہ ترقی ہو گی۔ مگر عالمی سطح کے سیاسی لوگ الجھ پڑے۔ سٹیٹ کرافٹ کے ہاتھوں وہ بھی مجبور تھے۔ بلوچستان کی معدنی دولت تھی اور سواحل بھی سارا سال کھلے رہتے جب کہ روس کے پاس ولیڈی واسٹک قسم کی بندرگاہیں تھیں جو چھ ماہ برف باری سے بند رہا کرتیں۔ امریکہ نے روس کے گرد گھیرا تنگ کر رکھا تھا۔ بلوچستان بھی اس غیر اعلانیہ لڑائی کی زد میں آ گیا۔ سردار نواب جو صدیوں سے بلوچستان کی تقدیر کے مالک رہے اب بھی اقتدار میں تھے بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائیزیشن جو سرداری نظام کے خلاف تھے۔"(7)

آغا گل نے سبالٹرن وجود کی اُس کربناک صورت حال کو نمایاں کیا ہے جہاں شناخت کا اظہار بھی جرم بن جاتا ہے۔ سبالٹرن خطوں کی پہلی محرومی یہی ہوتی ہے کہ اُن کی پہچان کو سرکاری اصطلاحات میں تحلیل کر دیا جاتا ہے۔ دوسری سطح پر عالمی طاقتوں کی سردجنگی حکمتِ عملی نے بلوچستان کو ایک مہرہ بنا دیا۔ وسائل معدنی دولت اور ساحلی پٹی عالمی سیاست کے لیے کشش رکھتے ہیں مگر مقامی آبادی کے لیے وہی وسائل محرومی اور استحصال کا سبب بنتے ہیں۔ آغا گل کے مطابق سبالٹرن خطہ (بلوچستان) اپنی دولت کے باوجود ترقی سے محروم رہتا ہے کیونکہ فیصلہ سازی کا اختیار اس کے پاس نہیں۔ دشت وفا میں آغا گل بلوچستان کو ایک ایسے خطے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو عالمی طاقتوں کی بساط پر مہرہ بھی ہے اور داخلی جبر کا شکار بھی مگر اسی کے اندر مزاحمت کی نئی کونپلیں بھی پھوٹ رہی ہیں۔

دشتِ وفا میں آغا گل نے بلوچستان کی سیاسی تاریخ کو سبالٹرن بیانیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناول میں ریاستی طاقت، سرداری نظام، عالمی سیاست اور عام بلوچ عوام کے باہمی تعلق کو اس انداز سے دکھایا گیا ہے کہ بلوچستان ایک ایسے خطے کی صورت سامنے آتا ہے جو داخلی اور خارجی قوتوں کے دباؤ میں مسلسل اپنی شناخت اور خود مختاری کے لیے برسرِپیکار ہے۔ یہ ناول اُن آوازوں کو سامنے لانے کی کوشش ہے جو ریاستی اور اشرافی بیانیے میں دب جاتی ہیں۔ خصوصاً پہلی بلوچ حکومت کے خاتمے اور اس کے بعد کی سیاسی صورت حال کو آغا گل نے ایک ایسے مرحلے کے طور پر پیش کیا ہے جہاں جمہوری امکانات مسلح سیاست میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور عالمی طاقتیں اس خطے کو اپنی سرد جنگی حکمتِ عملی کا حصہ بنا لیتی ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

"بلوچستان کی پہلی حکومت ٹوٹی تو سرداروں، نوابوں نے جمہوری جدوجہد آئینی طریقہ اختیار کرنے کی بجائے نوجوانوں کو مسلح کر کے پورے بلوچستان میں جنگ چھیڑ دی۔ روس نے افغانستان کے ذریعے خوب مدد کی۔ اُدھر امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ بلوچستان روسی اثرات قبول کرے۔ وہ بھی کود پڑا۔ شہنشاہ ایران رضاشاہ پہلوی امریکہ نواز تھا۔ اس نے جمہوری بلوچ حکومت کو کچلنے کے لیے پھلوں کے ٹرالر بھجوانے شروع کر دیے بظاہر پھل مگر اندر اسلحہ۔ سڑکیں بوجھ نہ برداشت کر سکیں۔ بہت سے دانشور افغانستان ہجرت کر گئے۔"(8)

آغا گل بلوچستان ایک ایسا خطہ ہے جہاں جمہوری امکانات داخلی سرداری سیاست اور عالمی طاقتوں کی مداخلت کے باعث مسلح تصادم میں بدل جاتے ہیں۔ نوجوانوں کو جنگ میں جھونک دیا جاتا ہے آغا گل کے مطابق عام بلوچ عوام اقتدار کی کشمکش میں بطور ذریعہ استعمال ہوتے ہیں۔

ناول کے آغاز میں تعلیم یافتہ مگر بے روزگار اور مایوس نوجوانوں کا حلقہ سامنے آتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی روشن مستقبل کے خواب دیکھے مگر صوبے کی سیاسی بے یقینی، معاشی ابتری اور سماجی جمود نے ان خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ یہی طبقہ سبالٹرن شعور کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اختیار سے محروم ہے۔ ان میں سے کچھ نوجوان علیحدگی پسند تحریکوں کا رخ کرتے ہیں جب کہ کچھ مایوسی کے عالم میں عیش و عشرت اور فرار کی محفلوں میں پناہ لیتے ہیں۔ آغا گل کے مطابق یہ تقسیم دراصل اس داخلی کشمکش کی علامت ہے جو محروم معاشروں میں جنم لیتی ہے۔

قاضی کا کردار سبالٹرن معاشرے کے ایک مخصوص نفسیاتی ردِ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ چالاک زبان دراز اور موقع شناس ہے مگر اس کی یہ مہارتیں کسی مضبوط سماجی ڈھانچے کا نتیجہ نہیں بلکہ عدم تحفظ کے ماحول میں زندہ رہنے کی تدبیر ہیں۔ وہ طاقت کے مستقل سرچشمے سے وابستہ نہیں بلکہ حالات کے بہاؤ کے ساتھ خود کو ڈھال لیتا ہے۔ آغا گل نے اس کردار کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جب نظام غیر منصفانہ ہو تو فرد اپنی بقا کے لیے اخلاقی لچک اختیار کر لیتا ہے۔ آغا گل قاضی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قاضی تو کئی ایک محکمے اور بے شمار کاروبار بدل چکا تھا۔ انشورنس ایجنٹ رہا، ٹھیکیداری کی، کاروں کا کاروبار کیا۔ اب کوئلے کے کاروبار میں نقصان اٹھا رہا تھا۔ اسی لئے وہ مالی طور پر خاصا پریشان حال تھا کیونکہ ایک دُبلے کو سنبھالنا بارہ سلنڈر کا نہ رکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ رہا وہ تو وہ خود سٹوڈنٹ تھا، لہٰذا مفلسی تو طے شدہ تھی۔ گھر سے ہر ہفتے ایک مقررہ رقم ملتی۔ دل ایک تھا، غم ہزار تھے۔ اسے آوارہ گردی کا شوق تھا اور یہ ایک بہت مہنگا شوق ہے، جیسے امراءہی افورڈ کر سکتے ہیں۔"(9)

آغا گل نے قاضی کے کردر کے ذریعے اس فرد کی تصویر پیش کی ہے جو معاشی طاقت کے مرکزی دھارے سے باہر کھڑا ہے۔ وہ بار بار پیشے بدلتا ہے لیکن ہر بار ناکامی اس کا مقدر بنتی ہے۔ یہاں اس کی ناکامی اس سماجی ڈھانچے کی نمائندگی کرتی ہے جس میں سرمایہ، رسائی اور اثر و رسوخ چند مخصوص طبقات کے پاس مرتکز ہیں۔ وہ محکمے اور کاروبار تو بدل سکتا ہے مگر اپنی طبقاتی حیثیت نہیں بدل پاتا۔ سبالٹرن کردار کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اس کی محنت کے باوجود اسے استحکام نصیب نہیں ہوتا۔ قاضی کے انشورنس ایجنٹ سے لے کر کوئلے کے کاروبار تک کا سفر اس معاشی فضا کی عکاسی ہے جہاں نچلے طبقے کا فرد سرمایہ دارانہ نظام میں ہمیشہ خسارے کے کنارے پر کھڑا رہتا ہے۔

نجیب اس کے برعکس ایک حساس اور اصول پسند نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ محبت میں خلوص رکھتا ہے اور سماجی معاملات میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ سرکاری منصب حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنے طبقے کی محرومیوں کو نہیں بھولتا۔ جب وہ اپنے باغی دوستوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ فیصلے بندوق کے ذریعے نہیں بلکہ علم، جمہوری جدوجہد اور ادارہ جاتی شمولیت سے حاصل کیے جا سکتے ہیں تو دراصل وہ سبالٹرن مزاحمت کی ایک مثبت صورت پیش کرتا ہے۔ اس کا شعوری تبدیلی پر زور دیتا ہے۔ نجیب کے الفاظ ملاحظہ کریں:

"میں انسانوں کے بلا سبب جھگڑے پسند نہیں کرتا۔ اور پھر آپ کون سے حقوق کی بات کرتے ہیں؟ حکومت مانگنا، حکومت کرنا، گورنر ہاؤس یا وزیر اعلیٰ سیکریٹریٹ چلانا آپ کا مطالبہ ہے، جب کہ عوام تو روٹی چاہتے ہیں۔ سڑکیں، پانی، بجلی اور روزگار۔ سڑکیں آپ نے فائرنگ سے بند کر دی ہیں۔ ریل کی پٹڑیاں آپ اکھیڑ رہے ہیں۔ کوہلو، ماوند میں بجلی لانے کی

اجازت نہیں ہے۔ کوہلوسی روڈبنانے کی اجازت نہیں ہے۔ روزگار کیا بندوقوں کی نالیوں سے نکلے گا؟ یا آسمان سے چپکے گا، من وسلویٰ کی طرح؟ یہ تو خیر ایک علاقے کی مثال دی۔"(10)

نجیب کا یہ مکالمہ طبقے کے شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ طاقت کے مراکز کی کشمکش کو مسترد کرتے ہوئے گفتگو کا رخ عوامی ضرورتوں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کون حکومت کرے گا بلکہ یہ ہے کہ عام آدمی کی زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی۔ یہی زاویہ سبالٹرن فکر کی بنیاد ہے جہاں توجہ اقتدار کے ایوانوں سے ہٹ کر ان لوگوں پر مرکوز ہوتی ہے جو ان ایوانوں کے فیصلوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

نجیب اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ اقتدار کی سیاست میں عوام کا نام تو لیا جاتا ہے مگر ان کی ترجیحات پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ جب وہ سڑکوں کی بندش، ریل کی پٹڑیوں کے اکھاڑے جانے اور ترقیاتی منصوبوں کی مزاحمت کا ذکر کرتا ہے تو دراصل وہ اس عمل کی نشاندہی کر رہا ہوتا ہے جس میں سب سے زیادہ متاثر وہی طبقہ ہوتا ہے جو پہلے ہی وسائل سے محروم ہے۔ آغا گل کے مطابق سبالٹرن وجود دوہری گرفت میں آ جاتا ہے ایک طرف ریاستی غفلت دوسری طرف مقامی طاقت ور طبقے کی بالادستی۔

نجیب اس ناول کا اخلاقی اور فکری مرکز ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، سنجیدہ ہے اور سرکاری منصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر اس کی داخلی کشمکش ختم نہیں ہوتی۔ وہ رخسانہ کی حقیقت جاننے کے باوجود اسے قبول کرتا ہے اور باغی دوستوں کو بندوق کے بجائے مکالمے کا راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کے ذریعے آغا گل یہ باور کراتے ہیں کہ سبالٹرن شعور متبادل سیاسی سوچ بھی پیدا کرتا ہے۔ نجیب کی دلیل کہ فیصلے بارود سے نہیں بلکہ شعور اور جمہوری عمل سے ہوتے ہیں، ناول کے فکری توازن کو ظاہر کرتی ہے۔

سبالٹرن ازم کی فکری بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ معاشرے کے وہ طبقات جو طاقت، سرمایہ اور ریاستی اختیار سے محروم ہیں ان کی آواز عموماً مرکزی بیانیے میں دب جاتی ہے۔ کہانی کا مرکز ایک نوجوان اور حسین طوائف رخسانہ ہے جس کے گرد قاضی، نجیب اور غفار جیسے کردار گردش کرتے ہیں۔ آغا گل کے ناول دشتِ وفا میں کردار رخسانہ طوائف اسی سبالٹرن وجود کی نمائندہ ہے۔ وہ دوہرے حاشیے پر کھڑی ہے ایک عورت ہونے کے باعث اور دوسرے طوائف ہونے کے سبب۔ اس حوالے سے اقتباس دیکھیں:

> "طوائفوں کا خیال تھا۔ پورا ملک ایک بہت بڑا چکلا ہے۔ لیکن زندگی خون اگل رہی تھی۔ بلوچستان کو آمریت کی ٹی بی ہو گئی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں سے لہو رس رہا تھا۔ نوجوان مر رہے تھے۔ جیلوں میں دم توڑ رہے تھے۔ تھانوں میں تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔ پہاڑوں میں سرگرداں نوجوانوں نے ہائی کمان کے اشاروں پر زندگی داؤ پہ لگا رکھی تھی۔ پورے بلوچستان میں سیاہی پھیل چکے تھے۔"(11)

آغا گل نے رخسانہ کو اس انداز میں پیش کر کے سبالٹرن کردار کو مرکزیت دی ہے۔ وہ صرف ایک طوائف نہیں بلکہ بلوچستان کے زخمی ضمیر کی آواز ہے۔ اس کی زبان میں تلخی ہے مگر یہی تلخی سبالٹرن بیانیے کی سچائی بن کر سامنے آتی ہے۔

رخسانہ کا کردار سبالٹرن ازم کے نسائی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جو سماجی دباؤ، معاشی ضرورت اور ماضی کے بوجھ تلے زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی پہلی شادی، شوہر کا قتل اور بچوں کی ذمہ داری اسے ایک پیچیدہ صورتِ حال میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے جرائم کو محض اخلاقی زوال کہہ دینا آسان ہے مگر دیکھا جائے تو وہ ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جہاں عورت کو مکمل اختیار حاصل نہیں۔ وہ دوہری محکومی کا شکار ہے۔ ایک طرف پدرشاہی نظام، دوسری طرف معاشی بے بسی۔ اس کی شخصیت کے ذریعے آغا گل نے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ حاشیے کی عورت کو اپنی بقا کے لیے غیر معمولی راستے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ناول میں بلوچستان کا جغرافیہ ایک فعال علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ درہ بولان، کوژک، جھیل ژاؤ اور قلات جیسے مقامات کرداروں کی داخلی کیفیات سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مصنف جب پرانے کوئٹہ کی فضا، ہوٹلوں کی محفلیں اور فلمی گیتوں کی گونج بیان کرتا ہے تو یہ فضا صرف نوسٹلجیا تک محدود نہیں رہتی یہ ایک ایسے معاشرتی ہم آہنگی کو واضح کرتی ہے جو وقت کے ساتھ تحلیل ہو گئی۔ اس یاد کے ذریعے مصنف حال کی تلخی کو زیادہ نمایاں کرتا ہے دشت وفا میں ماضی ثقافتی شناخت کی نمائندگی کرتا ہے جسے سبالٹرن طبقہ اپنے وجود کے اثبات کے لیے تھامے رکھتا ہے۔

سیاسی سطح پر ناول میں بلوچستان کی محرومیوں، سرداری نظام، وفاقی بے حسی اور علیحدگی پسند تحریکوں کا ذکر ایک متوازن انداز میں کیا گیا ہے۔ مصنف نہ تو یک طرفہ پروپیگنڈا کرتا ہے اور نہ ہی کسی بیانیے کو مکمل رد کرتا ہے۔ وہ دکھاتا ہے کہ جب سیاسی نظام نوجوانوں کو مواقع فراہم نہیں کرتا تو تشدد کی راہ اختیار کرنا آسان ہو جاتا ہے مگر اس کا انجام المیہ ہی ہوتا ہے۔ نجیب اور رخسانہ کی پہاڑوں کی طرف فرار کی کوشش اور بالآخر ان کی موت اس حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے کہ غیر یقینی حالات میں انفرادی محبت بھی اجتماعی بحران کی نذر ہو جاتی ہے۔

> "بد قسمتی سے گزشتہ سات آٹھ دہائیوں سے صوبہ بلوچستان سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر استحصال کا شکار چلا آتا ہے۔ فیڈریشن کی دیگر اکائیوں کے مقابلے میں بلوچستان 75 سال گزرنے کے باوجود مرکزی دھارے سے تکلیف دہ فاصلے پر ہے۔ 1970ء کے بعد بالخصوص بلوچی قوم اپنی شناخت کے حوالے سے پولرائزڈ چلی آتی ہے۔ بلوچی سردار بلوچیوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے درپہ ہیں۔ فیڈریشنسٹ قوم پرستجو وفاق کے ساتھ رہنا تو چاہتے ہیں مگر زیادہ سے زیادہ خود مختاری مانگتے ہیں۔"(12)

ناول میں بلوچستان کی سیاسی صورت حال بھی کہانی کے اندر ہی تحلیل ہے۔ سرداری نظام، وفاقی بے حسی، شناخت کا بحران اور علیحدگی پسند تحریکیں سب پس منظر میں موجود رہتے ہیں۔ مصنف کسی ایک بیانیے کی اندھی تائید نہیں کرتا بلکہ دکھاتا ہے کہ نقصان ہمیشہ عام لوگوں کا ہوتا ہے۔ جب نجیب اپنے ساتھیوں کو یہ قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بندوق کے بجائے علم اور جمہوری جدوجہد راستہ ہے تو یہ مکالمہ محض نظری بحث نہیں بلکہ اس کے اپنے تجربے کا نچوڑ ہے۔

مجموعی طور پر دشتِ وفا کو سبالٹرن ازم کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک ایسے معاشرے کی ادبی تصویر ہے جہاں تعلیم یافتہ نوجوان بے اختیار ہیں، عورت سماجی جبر کا شکار ہے، سیاسی شناخت منقسم ہے اور ریاست وصوبے کے درمیان اعتماد کا فقدان موجود ہے۔ آغا گل اپنے کرداروں کے ذریعے یہ باور کراتے ہیں کہ حاشیے کے لوگ محض اعداد و شمار نہیں بلکہ جذبات، خوابوں اور داخلی تضادات سے بھرپور انسان ہیں۔ ان کا دکھ محض سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی المیہ ہے۔ اسی لیے یہ ناول فکری طور پر اہم ہے، کیونکہ یہ بلوچستان کے سبالٹرن بیانیے کو محض نعرے کی صورت میں نہیں بلکہ جیتی جاگتی زندگیوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔

حوالہ جات

1. https://en.wikipedia.org/wiki/Subaltern_(postcolonialism)
2. فضل الرحمن تنہا غرشین، آغا گل کا بلوچستان ازم، مشمولہ: گل شناسی، ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ، 2025ء، ص:14
3. فاطمہ شاہین علی، آغا گل کا افسانوی مجموعہ پرندہ کا فنی و فکری جائزہ، بی ایس اردو (مقالہ)، گورنمنٹ ڈگری کالج پبی (نوشہرہ) الحاق شدہ یونیورسٹی آف پشاور، 2022، ص:7
4. فضل الرحمن تنہا غرشین، آغا گل کی ناول نگاری، مشمولہ: گل شناسی، ص:81
5. فیصل احمد گوندل، آغا گل کی کہانیوں میں سانس لیتا بلوچستان، 10 دسمبر 2016ء۔ https://www.aikrozan.com/
6. فضل الرحمن تنہا غرشین، آغا گل کے افسانوں مین کردر نگاری، مشمولہ: گل شناسی، ص:59
7. آغا گل، دشت وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، 2017ء ص:17
8. ایضاً، ص:18
9. آغا گل، دشت میں سفر، روبی پبلیشرز، کوئٹہ، 1986ء، ص:24
10. ایضاً، ص:20
11. ایضاً، ص:23
12. نعیم اشرف، آغا گل کا ناول: دشت وفا، 19 مئی 2025ء https://www.humsub.com.pk/509605/naeem-ashraf-93/